سماجی تبدیلی اور ادبی طنز: سوانح عمری مولانا آزاد

ڈاکٹر محمد نعیم*

Abstract:

Generalizations in scholarly works may prove helpful in understanding different literary trends of an era but not without losing much nuances. In Urdu, 19th Century is interpreted in binary oppositional manner with Sir Syed a pivotal point and other writers were considered either his extension or his rivals. The classic example of this generalization is Awadh Punch, a literary Journal which had a different attitude towards colonialism than Sir Syed's. The oversimplifications could only let the scholars to interpret its different authors in anti-Sir Syed perspective. This article attempts to analyze a text by Nawab Syed Muhammad Azad to underscore its distinct qualities and different approach towards colonial imprints on Subcontinent.

ہندوستان میں استعماریت کے قدم جمنے کے بعد اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیوں کے بارے اردو میں مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ ان پر عموماً علی گڑھ کے تناظر میں بحث ہوئی ہے اور ہماری عجلت پسندی نے انھیں دو متضاد رویوں کے تحت سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ علی گڑھ کو مفاہمت قرار دیتے ہوئے باقی مکاتبِ فکر کو مخالفت کی ذیل میں رکھا گیا ہے۔ دیو بند، فرنگی محل، دار المصنفین اور اودھ پنچ جیسے متنوع نظام ہائے فکر اور ان سے وابستہ مختلف مصنفین کو ایک ذیل میں رکھنے سے جو خلطِ مبحث پیدا ہوئے ان پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کسی ایک تناظر میں کی گئی تعبیر محدود ہوتی ہے۔ ایسی تعبیر صرف ان عناصر پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو اسے خوش آتے ہیں۔ باقی پہلوؤں کو یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے یا قصداً دبا دیا جاتا ہے۔ اودھ پنچ پر ہمارے مباحث ردِ علی

* شعبۂ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

گڑھ آئینے میں منعکس ہوئے۔اس سے متعدد تحریروں کی تفہیم میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔حال آں کہ اس رسالے میں ادب، سماج، سیاست اور مذہب جیسے متنوع موضوعات پر اظہارِ خیال ملتا ہے اور اس میں لکھنے والے بھی سب کیسب ایک ہی اسلوبِ فکر وطرزِ تحریر نہیں رکھتے۔لیکن قاری کی سہولت شاید اسی میں ہوتی ہے کہ سب کو کسی ایک زمرے میں رکھ کر دیکھے۔ایسی سہولت عام قاری کے لیے تو بھلے ہی کارآمد ہو لیکن اس سے بہت سی لطافتوں کے نظر انداز ہو جانے کا اندیشہ ہے۔علمی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کو اگر ایسی سہولتوں کی عادت ہو جائے تو عمومی تبصرے سامنے آتے ہیں، ادیبوں میں مماثلتوں کی تلاش رہتی ہے اور کاتا اور لے دوڑی جیسی علتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عمومیت سازی (Generalization) کے فوائد اپنی جگہ، نقصانات بھی کم نہیں۔اس سے مختلف ادیبوں اور کسی ایک ادیب کی متعدد تحریروں کی انفرادیت تک ہماری رسائی نہیں ہو پاتی۔مثال کے طور پر اودھ پنچ والے طنز و مزاح لکھ رہے تھے، وہ سیاسی نقطہ نظر میں کانگریس کے حامی تھے، وہ سرسید مخالف تھے، وغیرہ جیسے عمومی بیانات سے ان مختلف لکھنے والوں کے بارے کچھ خاص اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کی انفرادیت کیا تھی؟ ان جملوں پر سوال اٹھائے جا سکتے ہیں کہ کیا سب کا طنز ومزاح اپنے موضوع اور پیشکش میں ایک جیسا تھا؟ کیا سب نے ایک ہی جیسی تکنیکیں اپنائیں؟ کیا سب سرسید سے ایک جیسے اسباب کی وجہ سے اور ایک ہی درجے میں مخالف تھے؟ اور کیا سب کی کانگریس سے وابستگی اپنی نوعیت میں یکساں تھی؟ ان سوالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی ایک رسالے، تحریک، دور یا علاقے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں مماثلتیں یقیناً اہم ہوں گی تاہم افتراقات بھی اہمیت رکھتے ہیں جو عمومیت کے رسیا نظر انداز کر دیتے ہیں۔اودھ پنچ کے مصنفین کے ساتھ بھی ہماری عمومیت سازی کی کوششوں نے کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔اس مضمون میں نواب سید محمد آزاد کے ایک ناول کا تجزیہ کیا جائے گا۔ کوشش ہوگی کہ اس تحریر کے منفرد خیالات اور پیشکش کو سامنے لایا جائے اور یہ جو کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے اور جس ذریعے سے کرتی ہے ان کے جائزے کی مدد سے استعماری صورتِ حال پر اس ردِعمل کی انفرادیت کو گرفت میں لیا جائے جو نواب سید محمد کو اودھ پنچ کے دیگر لکھنے والوں سے مختلف بناتی ہے۔

سوانح عمری مولانا آزاد (۱۸۹۱ء) (آئندہ سوانح) متکلم راوی کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ ابتدا میں سوانح عمری کے خصائص اور مقبولیت کے مباحث اٹھائے گئے ہیں۔ یہ مباحث فکشن کی رسومیات (Conventions) سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو ناول کے تشکیلی دور (انیسویں صدی کا آخری نصف) میں زیادہ تر مصنفین اس کی رسومیات کو دیباچوں یا تمہیدوں میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔اس کے مختلف عناصر، موضوع اور پیشکش کے حوالے سے اپنے تصورات پیش کرتے ہیں۔(۱) سوانح کے مباحث میں چند نکات معاصر ادبی ذوق کی تفہیم کا سامان رکھتے ہیں۔انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں 'زوال' سے نکلنے کے لیے بے تاب

اور اور پنے 'ڈھب' پر لانے کے لیے اتاؤلے، ہر دو طرح کے مصنفین کی پسندیدہ صنف سوانح عمری تھی۔ انگریزوں کی طرف سے لکھی جانے والی سوانح اور ان کے جواب میں تحریر کی گئی کتب دونوں قاری کے لیے رول ماڈل کی تشکیل میں مصروف تھیں۔ تحریر کے ذریعے قاری کی رہنمائی کا خیال نیا نہیں تھا۔ قصے کہانی اور حکایات کی مدد سے مختلف اقدار کی ترسیل و ترویج کا طریقہ پہلے بھی رائج تھا۔ کسی شخص کی زندگی کو مثال بنانا ضرور نیا تھا۔ تمہید میں بیان ملتا ہے کہ عظیم لوگوں کی سوانح کو مفید اور تشہیر کے لائق خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ مستنبط کیا گیا ہے کہ عام آدمی جو ''گمنام اور غریب اور بے علم'' ہو اس کی سوانح بھی ''عمدہ اور پر اثر'' ہو سکتی ہے۔ عام آدمی کی زندگی سے دلچسپی نے اردو ناول کا آغاز کیا۔ یہاں یہ دلچسپی شعوری سطح پر بیان کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کے بعد کا بیان ادبی روایت میں آنے والی تبدیلیوں پر طنز ہے۔ عام آدمی کی زندگی سے یہ دلچسپی ''ممالکِ بیضان اور دیگر تہذیب یافتہ ملکوں'' کی مثالوں کی پیروی کے سبب سامنے آ رہی ہے۔ ان ملکوں میں ''اس قسم کی نہیں معلوم کتنی تصانیف [شائع] ہو رہی ہیں۔'' بعد ازاں موجود سوانح عمریوں پر نقد کیا گیا ہے کہ یہ صرف و محض اوصاف سے معمور ہوتی ہیں۔ آزاد کہتا ہے کہ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے معشوق میں عاشق کو صرف خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ ان میں

> ''کسی عاشق مصور کے قلم سے اس کے معشوق کی عمدہ تصویریں ہیں جن میں نہایت کوشش اور بڑی محنت سے ہر عیب کو چھپایا، ہر نقصان کو کمال بتایا اور ہر ادنیٰ سی صفت کو خوب چمکایا گیا ہے۔''(۲)

یہ بات تو کسی قدر قابلِ قبول ہے کہ کسی کی موت کے بعد اس کی برائیوں کو تنقید کی سان پر نہ چڑھایا جائے۔ تاہم رائی کا پہاڑ بنانا بھی بدمذاقی ہے۔ تمہید میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ اس سوانح میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیاں بھی درج کی جائیں گی۔ کیوں کہ راوی کا ماننا ہے کہ جہاں خوبیوں کا بیان اثر رکھتا ہے وہاں ''ناکامیابی اور ناتجربہ کاری کی مصیبت کا بیان [بھی] دوسروں کے لیے ایک جدید منفعت'' کا حامل ہے۔ جدید طرزِ فکر میں خامیوں کے تذکرے کو منفعت بخش خیال کرنے پر طنز کیا گیا ہے۔ بات بھلی ہو کہ بری 'منفعت' تلاش کرنے کی روش چل نکلی ہے۔ سوانح میں عیوب کو چھپانے کی روش پر جو تبصرہ موجود ہے اس سے مصنف کی منطقی فکر اور ہیئت میں مختلف کڑیوں کو ملانے کے شعور کا پتہ ملتا ہے۔ ''ایک واقعے کو چھپانے یا رنگ دینے سے دوسرے کسی ایسے واقعے کی جو اس سے ملحق یا منسلک ہو، اہمیت اور قوت گھٹ جاتی ہے۔ کیوں کہ واقعات کے چین سے ایک حلقے کا غائب کر دینا گویا اس زنجیر کو کمزور بنانا ہے۔'' کسی واقعے کی اہمیت اور تفہیم اس کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے۔ ویسے بھی اندھیرا روشنی کی اہمیت اور امتیاز کو بڑھاتا ہے۔ اس لیے پسندیدہ واقعات کا یک طرفہ بیان ان کی صحیح قدر و قیمت اور اثر پذیری کو کم کر دیتا ہے۔ راوی سوال اٹھاتا ہے کہ جو پاکیزہ سوانح عمریاں تحریر ہوئی ہیں کیا ان کے

ممدوح فرشتے تھے؟ وہ طنز کرتا ہے کہ ''کیا نیچر کی چپت سے ان کی چھلی اور چمکتی ہوئی چاندنی برابر محفوظ رہی؟''(۳) نیچر کا لفظ یہاں خارجی حقیقت کا اظہار ہے۔ یعنی زندگی جیسے باہر ہے اسے ادبی نمائندگی میں بھی ویسے پیش کرنے کی کوشش کرنا۔ اب انسان کو اچھائی برائی کا مرقع تصور کیا جانے لگا ہے۔ وہ باقاعدہ تفریق جس میں داستانوی کردار یا اچھائی کے نمائندہ ہوتے تھے یا برائی کے اب اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ دوسری اہم بات 'برائی' کو 'نیچر' کے ساتھ منسلک کرنا ہے۔ گویا لغزشیں نیچر کا بنیادی حصہ ہیں۔ یہاں انسان خیر یا شر کا نمائندہ نہیں بلکہ اس کے جسم و جاں خیر و شر کی رہ گزر بن گئے ہیں۔

سوانح عمری کی خامیوں کا ذکر کر کے متکلم راوی اپنی سوانح کو ان کجیوں سے پاک رکھنے کا عزم کرتا ہے۔ یہاں راوی اپنی سوانح کے ممکنہ ردِعمل کا ذکر چھیڑ کر رسومیات سے کھیل رہا ہے جو قارئین کے لیے حقیقت نمائی کا عنصر بن جاتا ہے۔ تمہید نے ان میں توقعات بیدار کرنے میں مدد دی ہے اور آغاز سے ہی ان کی دلچسپی کو مہمیز ملتی۔ جب یہ جملہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ اس کتاب میں ایسی باتوں کا بیان بھی موجود ہے جن سے راوی کو دیس نکالا مل سکتا ہے، حتیٰ کہ راوی کی عمر بھر کی ریاضت خاک میں مل جائے تو پڑھنے کی خواہش دوچند ہو جاتی ہے کہ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو یہ نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ اپنے بیانات کو قابلِ یقین بنانے کی کوشش میں راوی یہ بیان بھی دیتا ہے کہ اس نے کتاب میں کوئی بات سنی سنائی نہیں لکھی بلکہ صرف ''ذاتی معلومات'' سے سروکار رکھا ہے۔(۴)

نواب نے سوانح کے آغاز میں آزاد کی عمر سات برس بتائی ہے۔ ماں باپ کے بارے اس کے مشاہدات کا بیان طنزیہ ہے۔ وہ ہندا سلامی روایت کا 'مرقع' ہے۔ ماں کے بارے لکھا ہے کہ وہ ''شباہت سے مسلمان معلوم ہوتی تھیں'' اور باپ ''ہندونما'' ہے۔ یہ بیان مشترک تہذیبی روایت سے زیادہ جدید زندگی کی ٹوٹ پھوٹ اور غیر ثقہ پن پر ایک سخت رائے ہے۔ خود نواب کی پوزیشن قبل استعمار (Pre-colonial) سماجی روایتوں کے استناد سے نقد کے معیار لے رہی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نواب کا تعلق کلکتہ سے ہے اور وہاں جدید زندگی کے مظاہر ہندوستان کے دیگر علاقوں کی نسبت پہلے دیکھنے میں آئے۔ دیہاتی یا قصباتی زندگی میں جس طرح رسم و رواج، مذہبی عقائد اور سماجی شناختیں واضح ہوتی ہیں اور حفظِ مراتب کا نظام مختلف علامتوں کے ذریعے روزمرہ زندگی میں اپنا اظہار کرتا ہے، یہ مظاہر اس قدر ٹھوس اور واضح حد بندیوں کے ساتھ شہروں میں نظر نہیں آتے۔ عام آدمی جس کے پاس جاگیرداری کی سند اور غیر ہندوستانی شجرہ نہیں ہے اس کا ادبی موضوع بن جانا بھی یہاں کوئی پسندیدہ امر نہیں ہے۔ ماں باپ کے بارے کسی واضح بیان کی عدم موجودگی خاندان اور پیدائش کو مشکوک بنا رہے ہیں۔

کتاب کے مزاج میں نمایاں بات جدید مظاہرِ زندگی کے بارے ____ جو انگریزوں کی آمد اور ان کی حکومت کے نتیجے میں سامنے آ رہے تھے ____ ناپسندیدگی اور طنزیہ رویہ ہے۔ اگر قصے پر نظر کی جائے اور جو جو

بہروپ آزاد بھرتا ہے ان پر غور کیا جائے تو سب کا تعلق 'تمدن' سے ہے۔ اس سے مراد وہ رواج، عادات اور رویے ہیں جو انگریزوں کی تقلید یا ان سے میل جول کے نتیجے میں ہندوستانیوں کے ہاں پیدا ہوئے یا جنھیں صرف انگریز حاکموں کی وجہ سے تہذیب کا نشان تصور کیا جانے لگا۔ آزاد کی پہلی چوٹ ''جدید موحدانہ ہندی مذہب'' کی تحریک پر ہے۔ ذاتی اغراض نے اسے راستہ دکھایا کہ انگریزی دانی کی مدد سے وہ اس میدان میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے بارہ برس کی عمر میں ہی یہ بات جان لی تھی کہ ''دنیا میں کیوں کر دوسروں کو لات مار کر زینۂ کامیابی چڑھنا چاہیے اور اس کے لیے کیسے سامان اور کس قسم کے تہذیب یافتہ اور فرمائشی ایمان کی اشد ضرورت ہے۔''(۵)

یہاں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک ذاتی ترقی کا نشہ۔ ناولانہ فکشن میں کرداروں کا ایک اہم وصف انفرادیت ہوتا ہے۔ یہ وصف یہاں ذاتی ترقی کی خواہش میں ظاہر ہو رہا ہے۔ غرض مند ذہن کو ترقی کی راہیں جس مظہر میں سب سے پہلے دکھائی دیں وہ مذہب ہے۔ اس سے ایک طرف سماج میں مذہب کی قبولیت اور دونوں کے مابین نامیاتی تعلق کی خبر ملتی ہے وہیں جدید زندگی میں مذہب کو ذاتی غرض کے لیے استعمال کرنے کے چلن کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہاں مذہب 'فرمائشی ایمان' کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک شے (Commodity) کی ہے جسے استعمال اور فروخت کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ایمان 'تہذیب یافتہ' ہے۔ تمدن میں ایمان ایک فائدے کی شے بن گیا ہے۔ ایک باب مذہب کے بطور شے 'استعمال' کا بیان ہے۔ ان استعمالات میں مذہب کو امتیاز یا شناخت کا ذریعہ بنانا، ہم مذہبوں سے کھوکھلے قرب کا اظہار کرنا تاکہ مادی فوائد کا حصول ممکن ہو سکے اور برائیوں کے ذکر پر مصنوعی رعشہ طاری کرنا جیسی مثالیں شامل ہیں۔ یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ مذہب کی یہ تصویر جو آگے چل کر شناخت کی بنیاد قرار پائی، استعماریت کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ ہندوستانیوں کو بآسانی کنٹرول کرنے کے لیے کمپنی کے کارندوں کو اٹھارویں صدی میں ''قانون'' وضع کرنے کا خیال آیا جو مسلم اور ہندو قانون کی تشکیل کا سبب بنا۔ آبادی کی تفہیم اور اسے کنٹرول کرنے کے لیے بھی مختلف علاقائی، لسانی، معاشی اور سماجی شناختوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مذہبی شناختوں کا ڈول ڈالا گیا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شناخت سازی کا یہ عمل مستعمری (Colonized) ردِعمل سے مختلف منازل طے کرتا گیا اور بیسویں صدی میں یہی شناختیں سیاسی صورت اختیار کر گئیں۔(۶) نواب نے مذہب میں سے تقدس اور عرفان کے خروج اور اس کے سیاسی و معاشی مقاصد کے لیے استعمال کو درست طور پر نشان زد کیا ہے۔

کسی سماج میں تعزز کے معیارات افراد کو اکساتے ہیں کہ وہ خود کو ان کے مطابق بنائیں۔ قبل استعماری دور میں نسل اور قبیلے کی سماجی اہمیت کے پیشِ نظر خاندان اپنا شجرہ سنبھال کر رکھتے، مرتب کرواتے یا مثلاً پنجاب میں میراثیوں کو خاندانوں کے شجرے حفظ ہوتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں شجروں کی تیاری، بزرگوں کے علمی یا عسکری

کارناموں پر مشتمل واقعات اور عرب وعجم اور وسطی ایشیا سے تعلق، اٹھارویں صدی تک اثباتِ شرف کے مختلف ذرائع تھے۔ انیسویں صدی میں سماجی تبدیلی نے تعزز کے حصول کے نئے طریقے متعارف کروائے۔ استعماری حکومت کسی علاقے کے معززین کے نام ضلعی گزیٹیئر میں شائع کرتی۔ آبادی کی تفہیم اور شمار کے لیے مردم شماری اور اندراجی فہرستیں بھی تیار کروائی گئیں۔ آبادی کے اندراج کے یہ مختلف طریقے سماجی اعتراف کے حصول میں نئے امکانات بن گئے۔ آزاد اپنی چالاکی کا ذکر کرتا ہے جس میں وہ انٹرنس کی سند پر اپنے نام سے پہلے سید لکھوالیتا ہے۔ شجروں کی جگہ اب سرکاری گزٹ اور تعلیمی سند کا استعمال ہونے لگا ہے۔ اسی طرح عظیم آباد میں ایسے جدید مظاہر کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے جو ثقافتی تبدیلی کے نشان ہیں۔ ان میں انگریزی دانی، اخبار بینی، انگریزی اطوار پسندی، ترکی ٹوپی اور لامذہبیت بطور فیشن شامل ہیں۔ انگریز پسندی پر طنز کرتے ہوئے نواب نے لکھا ہے کہ ''پرانا، بدقطع، بدفشن، اور ذلت انگیز کوٹ پتلون [بھی] خلعتِ بیش بہا اور ملبوسِ دیبا نظر آنے لگا تھا۔'' اخبارات کی مستند حیثیت قائم ہو رہی تھی بلکہ انھیں صحائف کے برابر رتبہ دیا جانے لگا تھا۔ پردہ متروک ہو رہا تھا اور اسے ختم کرنے کی کوششیں بھی ہو رہی تھیں۔ ہر انگریزی شے یا وضع خوش نما معلوم ہونے لگی تھی، چھری کانٹے کا رنگ جمنے لگا تھا۔ محکوموں کی طرف سے انگریزوں کی نقل کے بیان میں طنز کا زہر دو آتشہ ہو جاتا ہے: ''گند [ے]، غلیظ اور غیر مہذب مکان [اور] مقام'' والے بھی اب انگریز بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (۷) پردہ ختم کرنے والوں سے مصنف کو شکایت ہے کہ باپ دادا کی بود و باش ترک کر رہے ہیں اور محکوموں پر انھیں غصہ ہے کہ اپنی حیثیت پہچاننے کی بجائے حاکموں سے برابری کی سطح پر ملنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کامیاب مذہبی مصلح نہ بن سکا تو آزاد سکول میں مدرس بن گیا۔ پٹنہ جیسے شہر میں علمی دھاک بٹھانے کے لیے وہ مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ معروف اخبارات کی فائلوں کو اپنے ہاں جمع کرنا، رسائل کے تازہ شماروں کو میز پر سجانا، بے مصرف ضخیم کتب کی لائبریری جمع کرنا، ملازم کو تاکید کرنا کہ کوئی ملنے آئے تو اسے بتائے کہ صاحب کتب بینی میں مصروف ہیں، اگر گھر پر موجود نہ ہو تو کہہ دے کہ ''کلکٹر صاحب یا جنٹ صاحب'' سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔ یہاں صاحبِ علم ہونا اہم نہیں، عالم دکھنا زیادہ اہم ہے۔ ''آلاتِ تہذیب و رعب افشانی'' کے دن ہیں بس دکھاوے سے ہی کام نکل آئے گا۔ تمام متن یہی غمازی کر رہا ہے کہ اب نمود و نمائش کو اہمیت مل رہی ہے اور چلتے پرزوں کا زمانہ آ گیا ہے۔ زمانہ سازی کا دور ہے تو آزاد ہر بار ایسا بھیس بدلتا ہے یا وہ روپ بھر لیتا ہے جسے قبولِ عام حاصل ہے۔ اگر نیچری مقبول ہیں تو وہ بلا جھجک نیچری بن جاتا ہے جو جدت اور دینی اصولوں کی عدم پابندی کے سبب خصوصاً نیم تعلیم یافتہ، نمائش پسند، سست مسلمانوں میں مشہور ہیں۔ ایک اہم نکتہ کہ آزاد کو اردو بھی اسی لیے سیکھنا پڑتی ہے کہ ''جدید مذہب کے کل رسالے، اخبارات اور کتبِ مقدس اسی زبان میں خاص قسم کی انگریزی نما جدید روش

میں تھے۔''(۸)

آزاد کے نزدیک روساء کی دماغی حالت مشکوک اور قویٰ میں اضمحلال آ گیا تھا۔ یہی لوگ نیچریوں سے زیادہ مرعوب ہوئے۔ انھی میں انگریزی دانی اور ''ریفارمانہ خصلت'' کے قدردان موجود تھے۔ یہاں نواب کا روئے سخن قدیم امراء اور جدید معززین دونوں کی طرف ہے۔ دونوں کی خامیوں پر وہ طنز کر رہے ہیں۔ روساء کے بارے یہ بیان بتا رہا ہے کہ شرف کے نئے معیارات تشکیل پا رہے ہیں۔ ان معیارات کی زد میں پرانے رئیس بھی رگیدے جا رہے ہیں۔ اب محض پیدائشی رئیس ہونا ناکافی ہے۔ ایک سے زیادہ ناولوں میں پرانے رئیس یا ان کی اولاد احمقوں کے روپ میں پیش ہوئے ہیں۔ سرشار کے ناولوں فسانہ آزاد، سیر کوہسار اور جامِ سرشار میں نوابوں کی تصویر کشی میں یہی پہلو نمایاں ہے۔ یہ رئیس تعیش اور مصاحبوں کے ہاتھوں لٹتے ہیں۔

آزاد کے ذریعے ان لوگوں پر بھی طنز کیا گیا ہے جو اصلاح اور نیچر کو پسند کرتے ہیں اور انگریزوں کو اپنا قبلہ وکعبہ مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آزاد ہر بار چکمہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ حصہ واضح طور پر سرسید کے خلاف ہے۔ اصلاح پسند 'سیدِ مغربی' کے عاشق ہیں اور ان کی تحریروں کی جا و بے جا تعریف کرتے ہیں:

> ''اردو میں ہم سیدِ مغربی کی عبارت اور تصانیف کی بے انتہا تعریف کرتے تھے اور بلا خیال اس کے کہ کوئی نسبت مشبہ اور مشبہ بہ میں ہو یا نہ ہو، بائرن، مکالے، ہملٹن، سر والٹر سکاٹ، گولڈ سمتھ، غرض جس انگریز سے جی چاہتا تھا ملا دیتے تھے اور اس پر حاضرینِ جلسہ بغیر علم کے کہ یہ سارے انگریز مصنف ومحرر تھے یا جنگلی جانور، بلا تامل صاد کر دیتے تھے۔''(۹)

اصلاً یہاں چوٹ سرسید پسندوں پر ہے جو انھیں اور انگریزی مصنفین کو بغیر سمجھے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ مصلحین پر آزاد کو اعتراض ہے کہ یہ تبدیلی کو مادی وجوہ کی بنیاد پر پسند کرتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد دنیاوی ترقی ہے اور اس کے لیے یہ لوگ اپنے عقائد اور تہذیب کو بھی قربان کرنے پر تیار تھے۔ نقد سے خود نواب کی پسندیدگی اور معیارات کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں عقائد اور تہذیب کے گم کر دیے جانے پر تاسف ہے۔ ان دو علامتوں کے ذریعے تصورِ کائنات اور حقیقت منقش ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان میں تبدیلی یا انحراف ایک بڑا نقصان ہے۔ جسے آرام پسندی کی عادت ہے وہ اس کی فراہمی کے لیے کچھ بھی چھوڑنے یا اپنانے پر آمادہ ہے اور یہی مقامِ افسوس ہے۔ جو کچھ پرانے اسلوبِ حیات میں میسر تھا اب اگر جدید سے اس کا حصول ممکن ہے تو اس کا دامن تھام لینے میں بھی تامل نہیں۔ آزاد کے ذریعے اس رویے کو طنز وتنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

اس کتاب میں تمدن کا لفظ انگریزی اثرات اور طرزِ حیات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرز سے قربت کے لیے پہلی رسائی انگریز حکام سے میل ملاقات ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہاں برطانیہ کی

نقلِ محض یا عیسائیت اختیار نہیں کی جارہی، صرف ایسے امور زندگی میں شامل کیے جارہے ہیں جن سے استعماری صورتِ حال (Colonial Situation) میں فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اگر کام محض حکام سے میل جول کے ذریعے نکل سکتا ہے تو اسے اپنایا گیا۔ دوسرے لباس اور وضع قطع میں انگریزی اسالیب کی پیروی، تمدن میں ترقی کا سبب سمجھی گئی۔ اس پر مستزاد حکام سے انگریزی خط کتابت، ان کے کاموں میں چندہ دینا یا کوئی خدمت انجام دینے کی پیشکش کرنا بھی فائدے سے خالی نہ تھا۔ انگریزی سے واقفیت کے سبب آزاد ایسے لوگوں کا خط نویس بن جاتا ہے۔ وہ روساء کی طرف سے حکومت کو انگریزی خطوط لکھ کر بھیجتا ہے اور ان کے جواب شکریے کے ساتھ موصول ہوئے تو ہر طرف اس کی شہرت پھیل گئی اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ انگریزی کی برتر اور سرکاری حیثیت کی وجہ سے اسے جاننے والوں کی مانگ تھی۔

استعماری دور میں اصلاحِ نسواں کا تصور بہت مقبول تھا۔ یہ سوال اہم تھا کہ سیاسی تبدیلی سے کیسے معاملہ جائے؟ باہر جو تبدیلی آرہی ہے اس کے گھر کے اندرون پر کیسے اثرات ہو سکتے ہیں اور آئندہ آنے والی نسل کو اس تبدیلی کے لیے تیار کرنے میں خاتون کا ممکنہ کیا کردار ہوسکتا ہے، ایسے سوالات اس دور کے مباحث کا حصہ ہیں۔ نواب کا ایک خاص طرزِ فکر ہے۔ انھوں نے اصلاحِ نسواں کو ایک بگاڑ کے طور پر دیکھا۔ ان کی رائے میں مغربی اثرات کے سبب اصلاح نسواں کے علمبردار عورتوں کو پردے سے باہر نکال رہے ہیں۔ اس سے مرد وزن میں آزادانہ میل جول کے مواقع پیدا ہوں گے۔ ایسی صورت میں انھوں نے مصلحین کو دلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ نکاحِ ثانی کی کوششوں کا انجام صرف یہی ہوگا کہ بے حیائی بڑھ جائے۔ ہماری رائے میں یہ ایک غیر متوازن طنز ہے۔ نکاحِ ثانی اور پردہ دو الگ الگ موضوع ہیں اور سماجی مصلحین مثلاً نذیر احمد (۱۰) جو نکاحِ ثانی کے مبلغ تھے وہ پردہ ختم کرنے کہیں بات نہیں کرتے، صرف اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے خواتین کے وہ حقوق سلب ہو رہے تھے جن کو ادا کرنے کی خدا نے بھی تاکید کی ہے۔ پھر یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ پردے کا مسئلہ اشراف ثقافت سے متعلق ہے۔

'قومی خدمت' ایک اور ایسا سلسلہ ہے جو اسی دور میں شروع ہوا۔ فرد کا کوئی عمل اپنے مضمرات میں اس کی ذات تک محدود نہیں بلکہ وہ اس کی قوم کا نمائندہ بننے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ ایک نئی ذہنی تشکیل ہے۔ ایک اہم نکتہ اس ذہنی تشکیل کا اپنے مفاد کے لیے استعمال ہے۔ 'قومی خدمت' کے نام پر اپنے ذاتی مفادات کے لیے کام کرنا ایسی روش ہے جسے آزاد نے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ آزاد 'قومی خدمت' کے لیے ایک اخبار نکالتا ہے۔ اپنے دور کے مذاق کے مطابق وہ اس کا نام 'قومی آرگن' رکھتا ہے۔ اپنی تحریروں کو مزید پُر اثر بنانے کے لیے وہ 'اسلامی آرگن' کے عنوان سے لکھتا ہے۔ اخبار کے سبھی کام اس اکیلے کے ذمہ ہیں: وہ ناشر ہونے کے علاوہ نامہ نگار، مدیر، پریس مین، کاتب اور

مصحح بھی خود ہی ہے۔ اخبار کو چلانے کی کیا کیا ترکیبیں تھیں ان کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اخبار کا پیٹ انگریزی خبروں کے غلط سلط ترجموں سے بھرنا، دوسری ترکیب مسلمانوں کی حالتِ ذار پر رودھو کر اور اپنی ردی حالت کا تذکرہ کر کے مختلف روساء کو اخبار کے پیشگی خریدار بنانا، تیسری، مقامی لوگوں کی کجیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبر بنانا جس سے جلد ہی وہ اخبار سے خوف زدہ ہو کر اس کے خریدار بن جائیں۔ ایک اور ترکیب اس بات کی تشہیر میں مضمر تھی کہ اس اخبار کو انگریز عموماً اور کلکٹر صاحب خصوصاً توجہ سے پڑھتے ہیں اور اس کے مندرجات ترجمہ ہو کر انگریزی اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ان کارگزاریوں کا نتیجہ نکلتا کہ ڈرپوک رئیس پیشگی اخبار کے خریدار بن جاتے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود آزاد کا اخبار سال بھر زیادہ نہ چل سکا۔ تاہم اس دوران میں آزاد نے مختلف رئیسوں سے میل جول بڑھانے کے لیے حکام سے اپنے تعلقات کو استعمال کیا۔

اخبار نویسی میں ناکامی کے بعد آزاد خوش عقیدوں کے دیس میں جعلی پیر کا دھندا اپناتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ اس معاملے میں مشرقی بنگالہ زرخیز ہے۔ مریدوں کو اکٹھا کرنے کے لیے صرف اپنی علمیت اور پارسائی کا ثبوت مہیا کرنا کافی نہ تھا۔ یہاں مناظرانہ صلاحیتوں کی مانگ تھی اس لیے مخالف مسلک کے عقائد کو نادرست اور اس کے بڑے ناموں کو حقیر ثابت حکمتِ عملی کا بنیادی حصہ تھا۔ پھر محض کسی ایک جگہ تکیہ بنا لینے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اسفار اور فیوض و برکات کی بارش کے لیے مریدوں کے علاقوں کو سیر کرنا ضروری قرار پایا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور انگریزی حکومت کی صبحِ عروج نے علما اور پیروں کو سفر پر مجبور کر دیا۔ مغل سرپرستی کا خاتمہ اور سفر کی بہتر سہولتیں دونوں ہی اس ضمن میں کردار ادا کر رہی تھیں۔ ریاستی سرپرستی اور مختلف امرا و روسا کی دستگیری نے علما اور گدی نشینوں کو آسودگی فراہم کی تھی اور وہ کسی ایک جگہ بیٹھ کر اپنی علمی اور درسی مصروفیات کو جاری رکھ سکیں۔ تاہم جاگیرداری کے خاتمے اور دستگیری کے پرانے اداروں کے خاتمے سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ یہاں یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہے کہ مریدوں کے ذریعے آمدن کا حصول ایک نیا امکان تھا جو معاشی بندوبست کی تبدیلی کی وجہ سے سامنے آیا۔ اس امکان کو پہلے سے معروف اور نووارد دونوں طرح کے علما اور پیروں نے استعمال کیا۔ اس امکان نے طباعت اور سفر دو ایسے ذریعے فراہم کیے جن کی مدد سے اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کیا جا سکتا تھا۔ یوں خود عالم اور پیر اپنی تحریر اور سفر کے ذریعے لوگوں تک پہنچنا شروع ہوئے۔ آزاد بھی یہی حکمت اختیار کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے ایسے علاقوں کا رخ کرتا ہے جو پیر پرستی کے حوالے سے معروف ہیں۔ وہاں وہ وعظ و تقریر کے سہارے مریدیں کا حلقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک مصاحب کو استعمال کرتا ہے جو اس کے بارے طرح طرح کی خبریں پھیلا کر اس کی علمیت، تقویٰ اور بلند مذہبی مقام و مرتبے کی تشہیر کرتا ہے۔ مصاحب جو پہلے گھر اور معاش کا منتظم اور مختلف ہنرمندیوں کی مدد سے اپنے مربی کی پرمسرت گزران کا اہتمام کرتا تھا اب نئے

معاشی بندوبست میں اس کی حیثیت تشہیر کار (Advertiser) کی ہوگئی ہے۔ جن دیہات میں جانا مقصود ہے وہاں پہلے ہی خطوط کے ذریعے پیر صاحب کے بارے ''اہلِ اسلام'' میں اچھی رائے بنادی۔ اس رائے کو پختگی دینے کے لیے مختلف روپ بھرے، ایسا ساز وسامان جمع کیا گیا اور ایسی عادات اپنائی گئیں جن سے پیر صاحب کا مقام ومرتبہ لوگوں کی نظر میں جم جائے۔ آزاد اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی کی تعریف کرتا ہے تاکہ وہ اور خشوع خضوع کا مظاہرہ کریں۔ مخالف مسالک کی توہین کے ذریعے آزاد مریدوں کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں اس کی تقریروں میں حبِ علیؓ سے زیادہ بغضِ معاویہؓ کا بیان ملتا۔ مذکورہ دیہات میں حنفیوں کی بجائے اہلِ حدیث کی کثرت تھی اس لیے آزاد نے تقریروں میں حنفیوں کو رگیدنا شروع کر دیا۔ ان تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے مناظرے کا چیلنج کر دیا جس کا اختتام گالم گلوچ سے ہوتا ہوا مریدین کے درمیان گھمسان کی لڑائی پر ہوا۔

اس رستاخیز سے نکل کر آزاد وکیل کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ اس پیشے میں کامیابی کے لیے انگریزی سے واقفیت ہی کامیابی کی کلید تھی جو پہلے سے آزاد کے پاس تھی۔ وہ حکام سے ملاقات، رئیسوں سے واقفیت اور دونوں سے کام نکلوانے کے ہنر کو وکالت میں کامیابی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دوسرا حربہ نامی اور مقبول وکلا کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کہ وہ انگریزی سے ناواقف ہیں تاکہ اپنی بلند قامتی کو ثابت کیا جا سکے۔ تیسرے وہ ایسے مقدمات لیتا جن میں جیتنے کے امکانات ہوں۔ چوتھے انگریزی سے ناواقف حاکموں پر اپنی زباندانی کا رعب جماتا۔ پانچویں امرا کے مقابلے غربا کی مدد کرتا اور ایسے مقدمات جن میں جیتنے کا امکان سو فیصد ہو وہ ''خرید کر لڑنا'' بھی اسی سے شروع ہوا۔

کسی علاقے میں عز وشرف کے سرکاری اور سماجی پیمانے اس میں زندگی کرتے کسی فرد کے لیے امکانات ہوتے ہیں۔ وہ پرورش کے دوران سیکھتا ہے کہ تعزز کے حصول کے لیے وہ انھیں کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ مغلیہ دور میں غیر ہندوستانی شجرہ اور علم وتیغ زنی جیسے ہنر سرکاری مشینری کا حصہ بننے اور مسلم سماج میں شرف حاصل کرنے میں معاون ہوتے تھے۔ انگریزی دور میں سرکاری تعلیم اور سرکاری کاموں میں حصے نے استعماری اداروں میں شمولیت کی راہیں آسان کیں۔ سماجی شرف کے پیمانے سیاسی اداروں سے زیادہ سخت جان ہوتے ہیں اور محض حکومتوں کی تبدیلی سے بدل نہیں جاتے۔ سیاسی اور معاشی نظام کی تبدیلی اپنے ساتھ ایسے امکانات لاتی ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ سماجی پیمانوں کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے 'اضافوں' کو شرف کی مسند پر براجمان زیادہ پسند نہیں کرتے۔ یہ ان کی مستحکم حیثیت کو تبدیل کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ آزاد سماجی شرف کے لیے انٹرنس کی سند پر اپنے نام کے ساتھ سید کا سابقہ لگوا چکا ہے۔ وہ اپنی ذاتی تحقیق سے ایسا شجرہ تیار کرتا ہے جس سے ''چند اعلیٰ اور نامی خاندانوں کے ساتھ'' اس کی قرابت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ حکام بھی اس کی ''افزائشِ اعزاز'' کرنے لگے اور وہ ان

کی مدد سے ''حصولِ اغراض میں کام نکالنے'' کے قابل ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شجروں کی اہمیت سرکاری گزٹ کے ورود سے ختم نہیں ہو گئی تھی۔ یہاں نواب اس فعل پر طنز کر رہے ہیں کہ کس طرح خود ساختہ شجروں کی مدد سے لوگ معززین میں شامل ہو رہے تھے۔ یہ ایک سطح پر مزاحمت ہے کہ وہ نظام کو بچانے یا اس میں آنے والی تبدیلیوں یا نقب لگانے والوں کو بے پردہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طنز آگے بڑھ کر ان لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے جو ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' کا حصہ بنتے ہیں۔ اس سے مصنف نے دو کام لیے ہیں۔ ایک تو انھوں نے ان لوگوں کی قلعی کھولنے کی کوشش کی ہے جو رفاہِ عام کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے حکومت کا حصہ بنتے ہیں۔ دوسرا طنز انگریزی نظام پر ہے جس میں اگرچہ معیار کا بہت شور رہتا ہے لیکن اس میں جگہ خود ساختہ معززین ہی کو ملتی ہے۔ یوں شاید یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریز مقامی آبادی کی تفہیم میں صحیح غلط اور اصلی و نقلی کی پہچان کرنے میں ناکام رہے اور ان کے دور میں نو دولتیوں کی بن آئی ہے۔ یہ نیا طبقہ اس لیے بھی طنز کی زد پر ہے کہ یہ ''نوابوں، زمینداروں اور عہدہ داروں کو کو حکمتِ عملی کے پیچ پر چڑھا چڑھا کر دے دے'' مارتا ہے۔ (۱۱) نواب نے ماضی کے کم حیثیت پیشوں سے وابستہ لوگوں کے سماجی مرتبہ بندی (Social Hierarchy) میں صعودی تحرک (Ascending) کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً قصائی ''گوشت کے معزز تاجر''، سبزی فروش ''اقسامِ نباتاتِ خشک و تر کے سرسبز تجار'' اور طوائفیں اور گانے بجانے والے ''خاندانِ عظمت نشان، موسیقی کے بڑے بڑے کامل فن'' کے واقف کار بن گئے ہیں۔ (۱۲)

نئے نظام میں 'دولت' ایک سماجی قدر بن گئی تھی۔ اس لیے حصولِ دولت زیادہ تر آبادی کی کوششوں کا نقطۂ ارتکاز بن گیا تھا۔ راوی کا کہنا ہے کہ ''یکا یک دولت مند بننے اور عیش کرنے کی کوئی تدبیر ایک دولت مند بی بی کے میسر آنے سے بہتر نہیں ہے۔'' اگرچہ یہ حکمتِ عملی نئی نہیں لیکن اس عہد کے تناظر میں یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہو گئی ہے۔ راوی کا جملہ ''شادی کے ذریعے سے ہزاروں آدمی ہندوستان میں امیر بن چکے ہیں'' (۱۳) اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اب یہ بات ایک Norm بن گئی ہے۔ اب زندگی کا مقصد ذاتی اغراض کا حصول ہے۔ دولت ہو، بیوی ہو، مذہب ہو یا پیشہ سب سے صرف ذاتی مفاد لینا مقصود ہے۔ مولانا آزاد افادہ پسندی کے دلدادہ ہیں۔ اس کے نزدیک فرد اور عقیدہ شے (Commodity) بن گئے ہیں۔ وہ عورت کو ''آلۂ رفعِ ضرورت'' کہتا ہے اور اسے ''بی بی'' سے ممیّز کرتا ہے۔ تہذیب یافتہ بی بی کسی اور کو بناتے ہیں اور ضرورت کسی سے بھی پوری کر لیتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو بادشاہ، نواب، امرا اور روسا کا مذہب بھی یہی تھا اس ذیل میں نواب کو ناحق مہذبوں سے گلہ ہے۔ آزاد کا مدح خواں جو، اب تشہیر کار بن چکا ہے اسے کلکتہ میں 'مصاحب' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور خود آزاد ایک نواب کا بھیس بھرتا ہے۔ مصاحب کلکتہ میں آزاد کو ایک نامی رئیس مشہور کرنے اور اس کی

نیک نامی پھیلا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کے حلقۂ احباب میں شامل کرنے کا موجب بنتا ہے۔ یہ کوششیں رنگ لاتی ہیں اور آزاد کی شادی من چاہی جگہ پر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف پردے کے سخت قائل ہیں اور وہ شریف زادیوں کے پردے سے نکلنے کو طوائف بن جانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ آزاد جب اپنی بیوی کو تھیٹر دکھانے اور باغ کی سیر کروانے لے جانے کو معمول بناتا ہے تو اس کی بیوی کے دیگر مردوں سے تعلقات استوار ہو جاتے ہیں۔ یہی بعد میں ان کے درمیان کشیدگی کا سبب بن جاتا ہے اور معاملہ عدالت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب کی نظر میں عورت جیسے ہی گھر سے نکلے گی اس کے مختلف مردوں سے ناجائز تعلقات قائم ہو جائیں گے اور وہ شوہر کے اختیار سے بھی نکل جائے گی۔ ایسا لگتا ہے ان کی نظر میں عورت اور مرد کے درمیان شاید ایک ہی طرح کا تعلق ہو سکتا ہے اس لیے جیسے ہی انھیں موقع ملے گا وہ یہ تعلق قائم کر لیں گے۔ انھیں ان مردوں سے کوئی شکایت نہیں جو یہ تعلق قائم کر رہے ہیں۔ نسوانی آزادی شوہر کو جیل کی ہوا کھلا سکتی ہے۔ ویسے اگر شوہر آزاد جیسا دغا باز اور چلتا پرزہ ہو تو اس کا یہ انجام فطری ہوگا یا برا؟ ایک سطح پر تو نسوانی آزادی اور تعلیم صحیح ثابت ہوگئی کہ اس سے دغا بازوں کو بے نقاب کرنے میں مدد ملی۔

ادبی طنز کے مختلف استعمالات ہیں: کجیوں کی نشاندہی، توازن کی تلاش، تضحیک، طعنہ زنی، سماجی ناہمواری پر چوٹ وغیرہ۔ (۱۴) کسی ناہمواری یا کجی کی نشاندہی تبھی ممکن ہے جب کوئی خاص معیار ہمارے پیشِ نظر ہو۔ پھر توازن کی تلاش کا عمل بھی اسی صورت مکمل ہوگا جب ہمارے پاس ان اقدار کا واضح تصور موجود ہو، جن کی ترویج ہمارا مدعا ہے۔ طنز کے معیارات بہت حد تک طنز نگار کے مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ نواب نے اس کتاب میں جن سماجی پہلوؤں اور مظاہر کو طنز کا نشانہ بنایا ہے وہ جدید ہیں اور ان کے پیشِ نظر معیارات عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کے جاگیردارانہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ سماجی اعتراف کے نئے پیمانے اور حصولِ عز و شرف کے نئے طریقے انھیں ناپسند ہیں۔ ان کے طنز کی بنیادیں اسی طرزِ معاشرت میں ہیں جو تبدیلی کی زد پر ہے اور اس تبدیلی میں ان کی پوزیشن پہلے سے کہتر ہو رہی ہے یا کم از کم اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں افتادگان کی طرف سے مسابقت کا سامنا ہے۔ جدید زندگی کے جن مظاہر سے انھیں خاص کد ہے ان کا تعلق سماجی ماحول کے بدلتے رجحانات سے ہے، جہاں محض نسل اور خاندان اب سماجی تعزز کی علامت نہیں رہے۔ طنز کے ذریعے سماجی تبدیلیوں کے نتیجے میں تہذیبی اقدار کے گم کر دیے جانے پر تاسف کا اظہار ملتا ہے۔ مذہب کے سیاسی یا معاشی استعمال کی قلعی کھولنے کی کاوش ان رویوں پر چوٹ ہے جن کے نتیجے میں سماجی تناؤ اور توہم پرستی کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے ہندی موحدانہ مذہب اور مسلم پیر پرستی دونوں پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مذہب یہاں عرفانِ ذات یا اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حصول کی بجائے اپنے معمولی مفادات کا تحفظ کرنے والوں کے ہاتھ باہمی چپقلش کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔

انیسویں صدی میں ان رجحانات کی نشاندہی کرنا اہم ہے۔ نواب کے طنز کی نوعیت اور اس کے معیارات پر نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں سماجی شناخت زیادہ اہم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نیر مسعود نے اس دور کے ناول نگاروں اور نقادوں کی ناول کے بارے آرا کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے ملاحظہ ہو: نیر مسعود، ''ناول کی روایتی تنقید،'' مشمولہ منتخب مضامین (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۶-۲۱۹۔؛ فرنچسکا اورسینی نے فسانہ آزاد کے ضمن میں سرشار اور ان کے قارئین کے درمیان خط کتابت کے تجزیے سے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ناول نگار اور اس کے قارئین کے ذہن میں ناول کے حوالے سے 'نیچر' کا تصور متشکل ہو رہا تھا جس کے تحت وہ ناول کو حقیقی زندگی سے قریب تر سمجھتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

Fracesca Orsini, "Generic Instability and Social Mobility: Pandit Ratan Nath Dar Sarshar's Fasana-e Azad," in Print and Pleasure: Popular Literature and Entertaining Fictions in Colonial North India. (Ranikhet: Permanent Black, 2009), p160-97.

۲۔ نواب سید محمد آزاد، ''سوانح عمری مولانا آزاد''، صبح صادق پریس، عظیم آباد، ۱۸۹۱ء، ص ۲-۱۔؛ مصنف اور مرکزی کردار دونوں کا نام آزاد ہے۔ خلطِ مبحث سے بچنے کے لیے اس مضمون میں کردار کے لیے آزاد اور مصنف کے لیے نواب استعمال کیا جائے گا۔

۳۔ ایضاً، ص ۵-۲۔

۴۔ ایضاً، ص ۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۶۔ استعماریوں (Colonizers) کی طرف سے ہندوستانی آبادی کی تفہیم کے نتیجے میں ان کی جدید شناختیں ___ جنھیں بعد میں خود استعماریوں نے روایتی (Traditional) کہا اور بعد ازاں مقامی آبادی بھی غیر محسوس انداز میں خود کو ان کے مطابق دیکھنے پر مائل ہوتی چلی گئی ___ کیسے وضع ہوئیں، اس کی تفہیم کے لیے ملاحظہ ہو:

Bernard S Cohn, Colonialism and Its Forms of Knowledge (Princeton: Princeton University Press, 1996)

استعماری کاوشوں کے نتیجے میں وضع ہونے والی مذہبی شناخت پر مزید بحث کے لیے دیکھیے:

Thomas Blom Hansen, The Safforn Wave: Democracy and Hindu Nationalism in Modern India (Princeton: Princeton University Press, 1999); Peter Van Der Veer, Imperial Encounters:Religion and Modernity in India

and Britain (Princeton: Princeton University Press, 2001)

۷۔ سید محمد آزاد، ''سوانح عمری مولانا آزاد''، ص ۲۱-۱۹۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۹۔ ایضاً، ص ۹-۲۸۔

۱۰۔ نکاحِ ثانی پر نذیر احمد کی رائے جاننے کے لیے دیکھیے: نذیر احمد، ''ایامیٰ''، مطبع شمسی، آگرہ، س۔ن

۱۱۔ نواب سید محمد آزاد، ''سوانح عمری مولانا آزاد''، ص ۱۲۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۱۴۔ طنز کی تعریف اور اس کے مختلف استعمالات پر عمومی بحث کے لیے دیکھیے: اشفاق احمد ورک، ''اردو نثر میں طنز و مزاح''، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۳۲-۲۸۔